eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813

کلام داغ کا تازہ تعبیری بیانیہ

A New Interpretational Narrative of Dagh's Poetry

ڈاکٹر محمد رؤف، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج سمن آباد، فیصل آباد
Dr. Muhammad Rauf, Assistant Professor of Urdu, Govt. Graduate College Samanabad Faisalabad
ڈاکٹر ساجد جاوید، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا
Dr. Sajid Javed, Assistant Professor Urdu, University of Sargodha

Abstract

When Mirza Ghalib gave up entertaining Urdu ghazal under the suppression of colonial regime, Mirza Khan Dagh proved to be his true replacement. He fully expressed the contemporary socio-political consciousness in his poetic works through particular erotic suggestion system of this genre. But ironically, applying the western critical parameters introduced by the colonial discourse, he was supposed to be vulgar and sex-oriented, paying no heed to the rich in between meanings of his pregnant couplets. In this research paper, a new interpretational reading of Dagh's poetry and its findings have been discussed according to which he proves to be the most vibrant interpreter of his colonial era. Keywords: Klam e Dagh, Colonial Discourse, Post-Colonial Theory, Traditional Poetics of Ghazal.

کلیدی الفاظ: کلام داغ، نو آبادیاتی ڈسکورس، نیو کلونیل ازم، مابعد نو آبادیاتی تھیوری، حیاتِ داغ، روایتی شعریات غزل۔

متن حسنت کہ قضا و قدر انشا می کرد
کاش با حاشیۂ مہر محشی می کرد(1)

زبان میں ایک ایسی استعاراتی قوت پوشیدہ رہتی ہے کہ بڑی سے بڑی مقتدرہ بھی

بناتا اور احساس و جذبات کی متنی تشکیل کرتا ہے تو بسا اوقات اس ساختیے میں ایسے سیاسی و سماجی بیانیے بھی اپنی معنوی آمریت مسلم کیے جاتے ہیں جن کا ہلکا سا اور اکی ارتعاش بھی تخلیق کار کے ذہنی کینوس پر موجود نہ ہو۔ صنف غزل سے مستعار پیرائے میں کہا جا سکتا ہے کہ ایسے میں

صریر خامہ " قلم در کف دشمن" ہونے کی غمازی کیسے جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی شروعاتی سخن آرائی کی ایک معروف غزل میں مصرعہ موزوں کیا تھا" زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہو گا"[۲] اس دیدار عام کے لیے چہرہ خوباں سے حجاب اکبر سرکانے کا پورا پورا اہتمام مگر ٹھیک نصف صدی بعد فرانز فینن اور ایڈورڈ سعید وغیرہ کی متعارفہ استحصال شناسی کی دانش و حکمت سے ممکن ہو پایا۔ جدید تنقیدی بصیرت نے متن کی نگارِ تازہ خیز کے خدوخال کچھ اس مہارت سے تراشے ہیں کہ سماجی حیوان کی ہر سرگرمی میں بھی اسی کا حسن مثال بحر موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔

ادبی متون کی رد تشکیلی قرأت کے لیے کلاسیکل، جدید اور جدید اور مابعد جدید متون میں سے کوئی متن بھی زیر بحث لایا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا اصل مدعا متن میں پوشیدہ اس فکری نظام کو متحرک کرنا ہے جس کے فعال ہوتے ہی اس کی ظاہری سطح پر چھایا ہوا فکری تانا بانا بکھرنے لگتا ہے یا اس کی اجارہ داری (Monopoly) قائم نہیں رہ پاتی اور نتیجتاً متن کے معنوی امکانات کی سرحدیں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں اس قسم کے مطالعات کے لیے زیادہ تر جدید یا مابعد جدید متون پر توجہ مرکوز رہی ہے؛ حال آں کہ ہر وہ کلاسیکل متن جس میں معروض سے گریز پائی کرتے ہوئے معنی کی عدم تعیین کا انصرام کیا گیا ہو، اس نوع کی رد تشکیلی قرأت کا اس قدر حق دار ٹھہرتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو مرزا خاں داغ کی شاعری میں رد تشکیل کے بہت سے زاویے ذوق عریانی لیے آج تک مستور چلے آئے ہیں۔ ہمارے ادبی نظر بازوں کی توجہ ان پر یوں بھی نہ آ سکی کہ یہاں معنویت رمز و کنایہ کی گہری تہوں میں ملفوف ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر تخلیق کار کی نجی زندگی نے بھی سدّ سکندری کے جیسی ایک بڑی رکاوٹ حائل کر رکھی تھی۔ البتہ جدید تنقیدی تھیوری فکر و نظر کی ایک ایسی جوہری توانائی کا نام ہے جو اس طرح کی ہر رکاوٹ کو عبور کر کے متن کے مافیہ کو آزاد فضاؤں میں پرورش دینے کے لیے جملہ حدود و قیود سے باہر نکال لاتی ہے۔ لہٰذا ایسے میں داغ کا کلام ان کی نجی زندگی سے حاصل ہونے والی معلومات کی سیادت میں پڑھنے کے بہ جائے ان کی شعری کائنات (Lexicon of signification) کے حوالے سے دیکھنا ضروری قرار پاتا ہے۔ ان کے کلام میں خیال افروزی اور تہہ داری (Suggestion) کی اس قدر شدت ہے کہ بعض بعض غزلوں میں تو گویا" سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا" یعنی ظاہری کلام کی اوٹ سے شاعر کا مدعا تانک جھانک کرتا صاف دکھتا ہے۔

مابعد نو آبادیاتی پڑھت کا عمل ایک لحاظ سے نو تعمیریت کا عمل بھی ہے جس کی فکری اساس متن کی دو گونہ، سہ گونہ یا چہار گونہ معنویت اور بسا اوقات اجتماع ضدین کے

تعبیری امکانات پر استوار ہوتی ہے۔ متن کی ڈیکوڈنگ کے اس عمل میں ہم معنویت کی ظاہری پرتوں کو ہٹا کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ معاصر عہد کی وہ کون کون سی صداقتیں تھیں جنھیں تاریخ کی گردنے ڈھانپ کر نظروں سے اوجھل کر دیا مگر وہ جبریت کے حائل کردہ ان پردوں سے نکلنے کے لیے بے تاب رہیں۔ فارسی شاعر صائب نے ان کہی کے اظہاری پیرایوں کی لطیف بصیرت یوں شعریائی ہے:

می توان خواند ز پشت لب او بے گفتار
گنے چند کہ در زیر لبش پنھانست(۳)

کسی متن کی رد تشکیلی قرآت ایک ایسا قرینہ ہے جس میں فن پارے کے ظاہری شوروغل کو پس انداز کرتے ہوئے اس کے نچلے سُروں میں گونجتی صداقتوں، عصری ترجمانیوں، روایت سے جڑی یا اس سے دامن کشاں عصبیتوں کو سننے اور معاصر سیاسی، سماجی، ثقافتی اور علمی منظر نامے کے ضمن میں یہاں روبہ عمل مختلف حسّیات کے پیچ دار سلسلوں کو کھوجنے اور جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا جدلیاتی طریق کار ہے جسے بروئے کار لانے سے متن حصار میں سرگرداں سچائیوں کے رنگارنگ روپ بہروپ سامنے آنے لگتے ہیں۔ اس ضمن میں Petter Berry لکھتے ہیں:

"Deconstructive reading uncovers the unconscious rather than the conscious dimension of the text."(4)

رد تشکیلی تھیوری کی اطلاقی موزونیت اور انکشافی امکانات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اردو غزل کے کلاسیکل عہد میں سے داغ کی شاعری ایسی قرآتی سرگرمی کی سب سے زیادہ متقاضی رہی ہے۔ جب ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے ناکام ہونے پر سلطنت ہند تاج برطانیہ کے زیر تسلط آئی تو نووارد آقاؤں کی خصوصی توجہ یہاں کی تہذیب وثقافت کے ہر اس پُراسرار اظہاری قرینے پر منعطف رہنے لگی جس میں معنی و مطالب کی ایمائی ترسیل کا ذرا سا بھی احتمال ہو سکتا تھا۔ ایسے میں زبان اور اس کے پروردہ شعر وادب کے تخلیقی فن پارے ترجیحی بنیادوں پر محل نظر ٹھہرے۔ اس عہد میں انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے اٹھنے والی نیچرل شاعری کی تحریک، محمد حسین آزاد کے "خیالات در باب نظم وکلام موزوں" اور حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے جیسی جملہ کاوشوں کا مقتدر کلامیاتی مطمح نظر ادبی اظہاریوں کو معروضی بیانیوں کا پابند بنانا تھا تاکہ ہندوستانی سماج کے فکری کینوس کا ہر ارتعاش بدیسی قوائے محسوسات کی حدود میں رہے۔ ایسے میں صنف غزل جس کا بنیادی وظیفہ ہی ایمائی اظہار ہے،

عصری جبریت سے کیوں کر فرار حاصل کر سکتی تھی، لہٰذا اسے سادگی، اصلیت اور جوش کی التباسی تثلیث کا پابند بنا کر مسیحانِ وقت کے تازہ ادبی معبدوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اگرچہ اتفاقاتِ زمانہ کی نادرہ کاری سے مذکورہ بیت اظہار کی یہ قلبِ ماہیت اس کے لیے ایک سرمایہ نمو ثابت ہوئی تاہم فی الوقت اس منصوبہ بندی کے پس پشت استعماری پالیسی ہی حاوی محرک کے طور پر کار فرما تھی اور بہ قول ڈاکٹر طارق ہاشمی جس کا منشا یہ تھا:

> "غزل سے اس کا جوہر خارج کر کے اسے ایک ایسی صنف بنا دیا جائے
> جس میں علامتوں کے پردے میں کسی ایسے خیال کا اظہار ممکن نہ ہو جو
> بیرونی حکومت کے لیے بغاوت یا سازش کا باعث بن سکے۔"(۵)

ایسی برہنہ حقیقت نگاری اور وقوع گوئی نفس الامر میں خود ایک پیراڈوکسیکل قسم کی چھیڑ خانی تھی جسے غزل جیسی نقاب پوش صنف سخن سے ہم آہنگ کرنا ایک قدیم روایتی معبد کو مسمار کرنے کے مترادف تھا۔ یہ جو مرزا غالب۔۔۔ کہ مشاہدہ، حق کی گفت گو بھی بادہ و ساغر کی رعایت سے کرنے کے عادی تھے۔۔۔ اچانک " غزل کا ڈھنگ بھول گیا"(6) کہہ کر خامہ فرسائی سے یکسر ہاتھ اٹھا لیتے ہیں تو اصل معاملہ یہی تھا کہ اب اس کی بساط پر قمار باز وقت ایمائی چال کے تمام امکانات ختم کرنے کا عندیہ دے چکا تھا اور بے تہہ کی سخن سازی مرزا کو گوارا نہ تھی۔ اقلیم ہند اور صنفِ غزل پر پڑنے والے ایسے پیغمبری وقت میں مرزا غالب کے وسیع خلا کی خانہ پری اور ان کے تخلیقی تعطل کی بھرپائی کے لیے مرزا خاں داغ صحیح مقام پر مطلوبہ حیثیت بنائے ہوئے پوری تخلیقی فعالیت کے ساتھ موجود تھے۔ داغ کی منظومات میں سیاسی تہہ داری کی لزومیت یوں بھی سمجھ میں آتی ہے کہ موصوف غالب ایسے شعرا سے کہیں بڑھ کر عتاب شاہی کے سزاوار تھے کیوں کہ ان کے والد شمس الدین خاں کو ریذیڈنٹ دہلی سمر ولیم فریزر کے قتل کی سازش پر سر عام بیچ چوراہے کے پھانسی دی گئی تھی۔ دیکھا جائے تو یہ اقدام قتل جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے ہیں سال پہلے اٹھایا جانے والا وہ انقلابی قدم تھا جو برطانوی استعمار کا مکر وہ جال توڑنے کے لیے براہ راست طور پر اٹھایا گیا۔ مزید برآں داغ کی والدہ ۱۸۵۶ء تک بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد بیٹے مرزا فخرو کے حرم میں رہیں اور یوں گویا مغل ولی عہد کا گیلڑ بیٹا ہونے کی بنا پر بھی وہ حاکم وقت کی نظروں میں کشتنی ٹھہرتے تھے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب غالب محض چند روزہ مصاحبت شاہی کے باعث غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد باز پرس کے لیے دھر لیے گئے اور نصف ایمان کو داؤ پر لگا کر "آدھا مسلمان" کی تصغیریت (Miniaturization) لیے ہی کٹہرے سے باہر آپائے___ جس معذرت خواہانہ طرز فکر کو پروفیسر فتح محمد ملک "ہندی مسلمانوں کی غلامی کا اولین باب" قرار دیتے

ہیں۔(۷) ___ تو داغ ایسا بھلا مانس اور سادہ کار شاعر کس شمار قطار میں تھا؟ معاصر سیاسی شعور میں گندھی داغ کی ان ادبی تخلیقات کا مقام و مرتبہ اور ان کی بین السطور رمزیت اس وقت دو چنداں ہو جاتی ہے جب ہم ان کے سوانحی حالات کے پیش نظر انھیں غالب جیسے شعرا سے کہیں بڑھ کر عتاب شاہی کا مطلوب و مغضوب پاتے ہیں۔ ان تمام خدشات و صدمات کے باوجود مرزا خاں داغ نے نو آبادیاتی ادبی کلچر کے برخلاف صنف غزل کی حریت کیش اقدار کی پرزور پاس داری کی اور اس میں معاصر سیاسی شعور کی بھرپور ترجمانی کرتے ہوئے ہم خیال مقامی معاشرت کی روح العصر کے لیے ایک سیفٹی والو کا کام کیا۔ انھوں نے نو آبادیاتی دور کے نصف اول میں جب انگریز آقاؤں کا جبر و قہر اپنے پورے عروج پر تھا، معاصر مزاحمتی کلامیے کو اپنی شعری تخلیقات کا موضوع بنا کر اردو ادب کے ایک ایسے خلا کو پر کیا ہے جس کی عدم خانہ پری پر بڑے تشویش ناک تنقیصی بگولے اٹھ سکتے تھے۔

ادبی سیاسیات کا یہ عمومی قاعدہ ہے کہ شعریات مقتدر کلامیے کے زیر اثر رہتی ہیں۔ مقدمہ حالی سے ہم آہنگ جدید غزل بھی شروع میں لاشعوری طور پر ہی سہی) اسی قاعدے کی عملی تفسیر تھی مگر اس کے مد مقابل داغ کی کلاسیکل غزل گوئی مشرقی شعریات کی مکمل پاس داری کرنے کے ساتھ ساتھ پورے طور پر مغرب مرکوز (Westo Centric) بھی رہی اور اس میں نو آبادیاتی دور کے جملہ سیاسی و سماجی تعاملات مثلاً عوام الناس کی باہمی ناچاکیاں، ریاستی امرا کے باغیانہ اقدامات، شاہ ہند کی کوتاہ اندیشیاں، مقامی حکمرانوں سے عوام کی مایوسی اور ان کی مائل بہ فنا روش وغیرہ بڑی صراحت سے تخلیقی عمل کا حصہ بنے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے داغ کے حالات و واقعات اور معاصر عہد کے جملہ متعلقات کو پس انداز کرتے ہوئے ذیل کے اشعار دیکھیے، جو اپنی مروجہ معنویت سے الگ ایک نئی معنوی دنیا بنائے نظر آئیں گے:

تو جو ہرجائی ہے اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی (۸)

رقیب اور وفادار ، پھر یقیں اس کا
مٹے ہوئے ہیں ترے رنگ اعتبار سے ہم (9)

تو نے پھنکوایا ہے بجلی سے ہمارا آشیاں
آتش گل سے یہی کہتی ہے جل کر عندلیب (۱۰)

کون سا آرام پایا آج تک
کیا کروں جائے اگر جاتا ہے دل(۱۱)

اسی طرح ایک اجمالی نظر میں نو آبادکاروں کی مقامی سیاست میں دخل اندازی، انتشار پھیلانے اور پھوٹ ڈالنے کی پالیسی، تجارت کے بہانے دفاعی و جارحانہ قلعہ بندیاں، مشرقی تاریخ وثقافت اور اقدار وروایات کی تنقیص کاری، بساط سیاست پر قدم جماتے ہی قوت کا بے دریغ استعمال اور مزاحمت کاروں کی بیخ کنی کے اقدامات، نیز اپنے استحصالی نظام کے قیام اور انتدابی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ مقامی معاشرت کی تحقیر اور خود بدولت کی تحسین و ستائش کے کچھ مناظر بھی دیکھیے:

خط غیر کا پڑھتے تھے جو ٹوکا تو وہ بولے
اخبار کا پرچہ ہے خبر دیکھ رہے ہیں(۱۲)

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں(۱۳)

تو نے ایسے بگاڑ ڈالے ہیں
ایک کی ایک سے نہیں بنتی(۱۴)

یہ کہہ کے مجھ کو کیا قائل اس کے درباں نے
وہ اپنے گھر کا کریں انتظام بھی کہ نہیں(15)

کہتا ہے زمانے سے برا مجھ کو وہ ظالم
کس کس کو مری لکھ کے برائی نہیں دیتا(۱۶)

تعجب ہے کہ اس بے داد پر بھی
تجھے اچھا کیا سارے جہاں نے(۱۷)

مجھ سے نفرت کس قدر ہے اس بت بے مہر کو
گنجفے میں بھی ورق رکھا نہ میری یاد کا(۱۸)

ان اشعار کی نو آبادیاتی معنویت کا عشقیہ معنویت پر جدلیاتی تفوق واضح ہے اور معاصر سیاسی و سماجی تجربے کو جذب و احساس کی ملکی آنچ پر جوش دے کر تغزل کے شیریں نغمات میں ڈھالنے کا یہی وہ عمل ہے جس کی تاثیر سے اردو کی سلطنتِ شعر کا یہ بے تاج بادشاہ راس کماری سے پشاور اور کراچی سے چٹا گانگ تک پوجا جاتا رہا۔ کلام داغ میں در آنے والے سیاسی شعور پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

"اس زمانے کی تاریخ کا داغ کی منظوم روداد نویسی سے موازنہ کریں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس نے بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں، زینت بیگم، فوج باغیہ، انگریز حکمرانوں اور انگریزی لشکر کے ایسے ایسے پہلو ہائے زندگی پر شعری تبصرہ و تنقید کی ہے جس کی بدولت مزاحمتی شاعری نت نئے رنگوں میں ظاہر ہونے لگتی ہے۔"(۱۹)

اگر داغ عصری آشوب کو محض بیانیہ پیرایے میں سامنے لاتے تو یہ غالباً اردو کی کلاسیکل روایت کا پہلا ناکام تجربہ ہوتا کیوں کہ تخلیقی اظہاریے کو برہنہ گفتاری سے پرلے درجے کی آہا ہے لہٰذا داغ کی عظمت فکر فی الاصل غزل کے مروجہ اظہاری پیمانوں کو کامیابی سے ایک نئے پیراڈائم کی ترجمانی کے لیے استعمال کرنے میں مخفی ہے۔ انھوں نے نہ صرف مروجہ رمزیہ پیمانوں کو وسعت آشنا کیا بل کہ انھیں التواء، تعطل اور ارتداد کے نئے تجربات سے بھی گزارا ہے۔ یہاں الفاظ و تراکیب اپنی معنوی تحدیدات، عمودی اشارتوں اور روایتی تعینات کو توڑ کر ایک ایسی شعریاتی فضا خلق کرنے میں کام یاب ہو رہی ہیں جس کی حسن آفرینی اور نادرہ کاری روایتی تعبیرات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کلاسیکل پیرایہ اظہار میں روح عصر کی پیراڈائم شفٹنگ کے اس تخلیقی بیانیے کی بابت شاعر مذکور کو اپنی شعریات پر جس قدر ریاض کرنا پڑا ہو گا، وہ بے تعصب طبائع سے داد کا طالب ہے۔ یقیناً اس کلام کی جدلیاتی شعریات جب ہنگامہ حیات کے مختلف زاویے وا کرتی ہے تو اہل نظر کے سامنے معنی کا چراغاں ہونے لگتا ہے، مگر آسمان نادرہ کار کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ہندوستان کی وسیع مملکت میں شہرت و نام وری کمانے والا یہی مرزا خاں داغ اس لحاظ سے بد قسمت ترین بھی رہا کہ مشرق کی کلاسیکل شعریات کے خمیر سے اٹھی اس کی تخلیقات کو نو آبادایتی کلامیے کے مروجہ تنقیدی پیمانوں سے ناپتے ہوئے اسے سوقیانہ خیالات، روایتی عشق بازی اور سانڈے کا تیل بیچنے والوں کی سی شاعری کرنے والے تخلیق کار وغیرہ جیسے طنزیہ و تحقیریہ کلمات سے مطعون کر کے بالکل

نظر انداز کر دیا گیا اور اس کلامیاتی خمار کی دیر یابی کا یہ عالم کہ مروجہ ادبی تواریخ میں بھی آج داغ کا وجود اگر ہے تو محض زبان کی صفائی اور محاورے کی دل کشی کے مرہونِ احسان ہے۔ دراصل اس نوع کا سطحی استنباط ایسی نارسا قرآتوں کا نتیجہ ہوتا ہے جو متن کو خارجی تناظر یا تخلیق کار کی نجی زندگی کے حوالے سے زیر بحث لاتی ہیں اور یوں گویا فی نفسہٖ ورائے متن تعبیر و تشریح کی ہی ایک متبدل صورت ہیں۔ ایسی تعبیراتی کاوشیں ہمارے تنقیدی کلچر میں بہت عام رہی ہیں۔ آج سے پانچ سات دہائیاں قبل اگر کوئی عزیز احمد، خواجہ منظور حسین یا سبط حسن جیسا نکتہ شناس ایسے متون کی رد تشکیلی جہات پر کوئی بات کر بیٹھتا تو دورائے متن تعبیروں کا خوگر مقتدر طبقہ اسے ایسا بھنبھوڑتا کہ پھر کسی کو اس نوع کی جسارت کرنے کا خیال بھی اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا کیے دیتا۔ البتہ اب یہ تنقیدی جبر کی صورت حال بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہے اور تھیوری کے مباحث نے فکر و نظر کی نئی راہیں وا کرنے میں بہت حد تک کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔ چناں چہ یہاں پس ساختیاتی منظر نامے کی رو سے یہ لازم آتا ہے کہ داغ دہلوی کے خانگی حالات وواقعات کے سلسلے میں بیشہ تحقیق کے ہمارے شیر مرد جو دور کی کوڑیاں لائے ہیں، انھیں کچھ عرصہ کے لیے طاق نسیاں پر رکھ دیا جائے تاکہ ایسا تمام تحقیقی سرمایہ جو فی الاصل بڑی حد تک سیاسی اغراض سے مملو نو آبادیاتی علمیات کے زیر اثر منصہ شہود پر آتا رہا، اس جدید طرز قرأت کے روبہ عمل آنے پر داغ کے پر مغز کلام کی تہہ در تہہ معنوی پرتیں کھولنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ بھلا اس ستم ظریفانہ اہتمام کا کیا جواز ہے کہ شاعر مذکور کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالنے سے پہلے ہم یہ مد نظر رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ:

- داغ دہلوی کی والدہ محترمہ کے عائلی احوال و مسائل کیا رہے۔
- داغ کے والد شمس الدین خاں کو ولیم فریزر کے قتل کی سازش کے بہ موجب پھانسی کی سزا ہوئی۔
- مرزا داغ خود کو پدری نسبت کے بہ جائے مادری سلسلے سے جوڑنا زیادہ پسند کرتے تھے۔
- قیام رام پور کے دوران میں داغ کا کلکتہ کی طوائف منی بائی حجاب سے معاشقہ ان کی زندگی کا اہم ترین جذباتی واقعہ ہے۔

مرزا خاں داغ کے ایسے گردش حالات کے ستائے شریف النفس اور مذہبی اقدار کو محترم جانے والے بے ضرر انسان پر اخلاقی قدروں سے بے نیاز اس نوع کی مادر پدر آزاد تنقیص کاری سے "اِنَّ المُلُوک" والی آیت دھیان پڑھنا فطری ہے۔ جدید تنقیدی شعریات ایسے اور اس قبیل کے دوسرے سیاسی و سماجی نکات کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت دینے کو تیار

نہیں۔ دراصل یہی وہ انتقادی دلیلیے ہیں جو قرأت کو متن اساس بنا کر ماورائی میجات کی تردید کا باعث بنتے ہیں۔ اگر ہمیں کلام داغ کی ایک بے لاگ قرآت درکار ہے تو لازم ہے کہ ان کے کلام کو "داغی کلام" سمجھ کر پڑھنے کے بہ جائے محض کلام شاعر کے طور پر پڑھت میں لائیں۔ شاعر مذکور کے کلام کی روایتی تفہیم کا ایک سبب مقتدر کلامیے کی طاقت کی پذیری نوع بہ نوع حرکیات بھی یقیناً تھیں اور استبدادی فضا میں خوف وخطر کے یہ اندیشے کچھ غیر منطقی بھی نہیں لگتے۔ لہذا ایسے ہی خطرات کے شعوری یا لاشعوری احساس کے زیر اثر اس خزاں رسیدہ چمن کے بلبل کا نالہ و فریاد عمومی لوک درک میں سرایت تو کرتا رہا مگر تحریری اقلیمات میں کھلے دل سے اس کی پزیرائی کبھی نہ کی جا سکی۔

البتہ یہ امر باعث طمانیت ہے کہ اردو شعر و ادب کے ماضی قریب سے تسلسل بنانے والے مطالعات میں بعض ناقدین نے کلام داغ کی صحیح معنویت نشان زد کرنے میں سرگرمی دکھائی ہے۔ اس ضمن میں خواجہ منظور حسین کی کتاب "اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ" بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس ابتدائی کاوش میں جب غزل کے بین السطور رو بہ عمل معنویت کی نقاب کشائی کی گئی تو صاحب کتاب کو شدید تنقید کا سامنا رہا اور شاید ایسا ہونا ایک عصری لازمہ بھی تھا۔ دراصل خواجہ موصوف کی مذکورہ کتاب میں صنف غزل کے جس معنیاتی نظام کو سامنے لایا گیا تھا، اس کے لیے امثال واعیان کا سامان تو فراواں تھا مگر ان امثلہ کی صوابت اور قبولیت جس نوع کے مضبوط نظری فریم ورک اور موثر منطق واستدلال کی متقاضی تھی، اس کا اہتمام ہنوز ناکافی اور غیر تسلی بخش تھا۔ ژاک دریدا کی رد تشکیلی فکر نے گذشتہ صدی کے نصف آخر میں ایک ایسی انقلابی فضا پیدا کی اور قرأت و تعبیر کے نئے امکانات دریافت کیے جو اس طرح کی وحدانیت گریز تعبیرات کو پذیرائی بخشنے میں فکری اساس کا درجہ رکھتے ہیں۔ یوں بھی دورِ حاضر میں جب کہ ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پار کر کے برطانوی عہد غلامی سے تقریباً ایک صدی کے معروضی فاصلے پر آ چکے ہیں، ایسے میں نو آبادتی دور کے جملہ متنی سرمائے کو پس نو آبادیاتی قرآتی تفاعل سے گزارنے، اس کی از سر نو تعیین قدر جانچتے اور حاصلات و نتائج کا نیا نظام مرتب کرنے کا مناسب ترین وقت میسر آ چکا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے بھی کچھ ابتدائی نوعیت کی تنقیدی کاوشیں کی ہیں جنھیں مزید نکھارنے میں ڈاکٹر وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، ابوالکلام قاسمی، قاضی عابد، اور شافع قدوائی وغیرہ نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ عہد حاضر میں کئی ایک دیگر اہم ناقدین کی طرح بالخصوص ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے متن، تصور تشکیل متن، سیاق و تناظر کے تعبیری موثرات، فلسفہ قرأت و تفسیر، قوموں کے ثقافتی تشخصات اور ان پر استعماری اجارہ داری کے کلامیاتی

موثرات کے جیسے نظری خدوخال واضح کرنے کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی بصیرت کے اطلاقی نمونوں کے طور پر "مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں" اور "ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری" جیسی اہم کتب تحریر کر کے اردو تنقید کے نو آبادیاتی دبستان کی بخوبی شیرازہ بندی کی ہے۔ مختلف جامعات کے تحقیقی شعبہ جات نو آبادیاتی دور کے متنی سرمائے کو اس زاویہ فکر سے جانچنے پرکھنے کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر طارق ہاشمی کے حالیہ مقالے "کلام داغ: مابعد نو آبادیاتی مطالعہ" میں نئی مقتدرہ کی متعارفہ اس شعریات کے استحصالی منطقوں کو نشان زد کیا گیا ہے جس کے زیر اثر رہ کر مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی جیسے اکابرین سے بھی شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے کلاسیکل ادبی سرمائے کی معذرت خواہانہ تعبیر و تشریح جیسے تسامحات سرزد ہوتے رہے۔ صنف غزل اپنے نقاب پوش رسمیاتی اسلوب میں رہتے ہوئے معنیاتی تشکیلات کے ایسے کثیر الجہتی امکانات رکھتی ہے کہ کہنے والوں کے لیے راہ سخن کبھی بند نہیں ہوتی اور اسی لیے اس کے رمزیہ نظام کو "عالم طلسمات" بھی کہا جاتا ہے۔[۲۰] اڑچن تب آن پڑتی ہے جب اسے میکالے اور بالرائیڈ کے جیسے زیرک لوگوں کی متعارفہ بدیسی قرأتِ متن سے گزارتے ہوئے "سنڈاس سے بدتر" قرار دینے کی رسم چل نکلتی ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر طارق ہاشمی بجا طور پر لکھتے ہیں کہ:

> "غزل کے سیاسی و سماجی کردار کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ اس صنف کے اسلوب، علامتی نظام اور اظہار کے دیگر قرینوں کا شعور نہ ہو اور یہی المیہ اردو تنقید کا ہے کہ ناقدین وہ Password یا تو جانتے نہیں یا معلوم ہونے کے باوجود اسے استعمال نہیں کرتے جس سے غزل کے سماجی کردار کی Window بہ آسانی کھل جاتی ہے۔"[۲۱]

پس واضح ہے کہ اس جدید طرز تنقید سے اردو ادب کے کلاسیکل سرمایے کی ایک نئی معنویت نکھر کر سامنے آتی ہے جیسا کہ زیر نظر مطالعے میں کلام داغ کی مابعد نو آبادیاتی قرأت کی صورت تشکیل پذیر ہو رہی ہے اور کلام داغ کی اس نئی تشکیل میں مذکورہ شاعر اس داغ سے یکسر مختلف ہے جس کی تصویر ماقبل کے نام ور ناقدین طوائف پرستی کے تناظر میں رہتے ہوئے ان کے کلام کو سوقیانہ اور بوالہوسی جذبات پر مشتمل قرار دے کر پینٹ کرتے آئے ہیں۔ ایسی ہی پے در پے روایتی آرا کی روشنی میں "داغی اشعار"[۲۲] کی اصطلاح تک متعارف کروادی گئی جو ایک طرح سے ادبی متانت کو اپنے ہاتھ سے دینے کے مترادف تھا۔ بلاشبہ داغ کی غزلیات میں عشقیہ کرداروں کی روایتی ثلیث (عاشق، معشوق اور رقیب) ہی

مرکزی اہمیت رکھتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں صنف غزل کے اس نظام اظہار کو معاصر حالات سے معادلت فراہم کرتے ہوئے شعرا نے اس کی لفظیات، کنایتی و علامتی اہداف، شعری ضابطوں اور عمومی رسمیات کو معاصر منظر نامے سے مطابقت دے کر اپنی ادبی ذمہ داری نبھانے کی راہ بہ خوبی ہم وار کر لی تھی۔ غزل کا بنیادی وظیفہ یوں بھی عشقیہ طرز اظہار (Erotic Expression) ہے نیز عشقیہ تلازمات اور کردار واقدار میں سیاست، محبت اور تصوف کی ایک ایسی سہ جہتی معنوی اشتراکیت موجود ہے جو اسے ایمائی ترسیل معانی کا محفوظ ومامون ذریعہ بناتی ہے۔ اس شعریاتی بصیرت کی تشویق وترویج کے آثار بھی متغزلین کے ہاں فراواں ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

پایا ہر ایک بات میں اپنی کے یوں تجھے
معنی کو جس طرح سخن عاشقانے میں (۲۳)

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور (۲۴)

نظم اکبر سے بلاغت سیکھ لیں اربابِ عشق
اصطلاحات جنوں میں بے بہا فرہنگ ہے (۲۵)

داغ کے ہاں اسی مقبول طرز اظہار کو اپنایا گیا اور نتیجتاً جبر و اکراہ کے اس بدترین دور کا ہلکے سے ہلکا سیاسی و سماجی ارتعاش بھی ان کے تخلیقی کینوس پر پوری صحت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کے لیے تصور متن کی کلاسیکل شعریات کو قبولنے اور رد تشکیلی قرأت کی بصیرتوں کو اپنے انتقادی درک میں جذب کرنے کی ضرورت ہے۔ مرزا داغ نے خود بھی اپنی غزلوں کی ان کہی معنویت اور بین السطور رمزیت پر جا بہ جا اصرار کیا ہے:

حال پہلو بچا کے لکھا ہے
تاڑ جائے وہ نکتہ چیں نہ کہیں (۲۶)

سرود و نغمہ مطرب کی آوازیں تو دل کش ہیں
مگر میری زباں اس کے سوا کچھ اور کہتی ہے (۲۷)

ہیں مجازی سے حقیقت آشنا
پہنچے ہیں اس راہ میں اس راہ سے(۲۸)

مرے ہر لفظ خط میں دو ہیں معنی
نہ کیوں ہوں دو زبانیں ہیں قلم کی(۲۹)

واضح رہے کہ اگر کلام داغ کی محض ظاہری صورت سے علاقہ رکھا جائے تو اس پر سوقیانہ خیالات، بوالہوسوں کی خرافات، محبوب کی دہشت گردیوں، عاشق کی خساستوں، کوٹھے والیوں کی تانک جھانک اور حیا باختگی وغیرہ جیسی ادبی لا قانونیت (Literary Anarchy) کے ایسے ہی فتوے عائد کیے جاسکتے ہیں جن کی مثالیں ہمارے روایت پرست ناقدین مثلاً شعر الہند کے فاضل ناقد (خواہ وہ کوئی بھی ہوں) نے بہ کثرت فراہم کی ہیں۔(۳۰) واقعہ یہ ہے کہ داغ کے کلام میں ایک ایسی مربوط استعاراتی قوت مستور ہے جو اسے نئی شعری صداقتوں سے ہم آہنگ بناتی ہے۔ اس استعاراتی قوت پر کوئی مقتدرہ اپنی اجارہ داری قائم نہیں کر سکتی۔ ان کے ہاں ہمیں ایک تمثیلی انداز کا ایسا بیانیہ دیکھنے کو ملتا ہے جس کی معنوی سطح کئی کئی زاویوں سے اپنی جلوہ نمائی کا امکان رکھتی ہے۔ ان کے کلام کی بالائی سطح عمومی بیانیے سے ہم آہنگ جب کہ زیریں ایک مخصوص سلسلہ خیال سے مربوط محسوس ہوتی ہے جس سے ایک ایسے شنوی جوڑے کا تصور بھرپور انداز میں ابھرتا ہے جس میں کوئی باہمی اشتراک و مماثلت موجود نہیں۔ یہی شنویت دراصل کسی متن کو نو آبادیاتی بیانیے سے ہم آہنگ قرار دینے میں قاری کی سیادت کا فریضہ سر انجام دیتی ہے۔ اگر داغ آیسے بڑے تخلیق کار کو کسی سیاسی شعور سے بے نیاز رہ کر خامہ فرسائی کرنے کا شائق فرض کر لیا جائے تو محمد علی صدیقی کے الفاظ اور خیال کی رعایت سے یہ محض ایک ادبی بچھو کا ہو گا۔(۳۱) اسی ضمن میں شمس الرحمن فاروقی کے یہ انتقادی حاصلات بھی قابل حوالہ ہیں:

> ”ایسے ادبی مطالعات میں سیاسی تناظر کی اہمیت محض تتمہ یا ممکنہ راستوں میں سے ایک راستے کی نہیں رہتی بل کہ یہ مطالعے کا افق مطلق (Absolute Horizone) ہوتا ہے۔“(۳۲)

یوں گویا کلام داغ کو اگر مزعومہ تعبیراتی منطقے سے نکال کر آزادانہ قرآتی عمل سے گزارا جائے تو اس سے صورت و معنی کے کئی امکانات مترشح ہونے لگیں گے کیوں کہ ایسا

کرنے میں قاری کو ان کی تخلیقی کائنات کے اصلی تحرکات اور سیال ساختوں تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ داغ ایک ایسی قوم کے حصار غلامی میں زندگی گزار رہے تھے جس کی پر شکوہ سلطنت پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا، مگر اسیری کی اس اندھیر نگری میں بھی ان کی چشم تخیل کے لیے صبح آزادی کا امکانی منظر نامہ دیکھنا ممکن نہ تھا۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

لذت سیر اگر چشم تماشا لے گی
یک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لے گی(۳۳)

واقعہ یہ ہے کہ غزل گو شاعر کے تخیلاتی امکانات کی سرحدیں بہت وسیع ہوتی ہیں لہذا اس پر کسی ایک زاویہ نظر یا زمان و مکاں کی مخصوص حدود کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ امر بھی واضح رہے کہ ایسے تخلیقی متون کی تعبیر و تفسیر کسی خاص قاعدے یا ضابطے کی پابند نہیں ہوتی بل کہ "متن کی ہر وہ تعبیر صحیح (Valid) ہے جو متن ہی سے بر آمد ہو۔"(۳۴) ادب ایک لحاظ سے نقاب پوش سماجی سرگرمی ہی کا نام ہے مگر یہ نقاب اس قدر تہ در تہ ہوتا ہے کہ ظاہر میں نگاہیں اس کے باطنی حسن کی جھلک بھی نہیں پا سکتیں۔ اپنے تخلیقی مرحلے میں نگارِ ادب کے اس نقاب کی پرتیں جوں جوں کم ہوتی جائیں گی، فن پارہ اس قدر تخلیق سے صحافت اور اظہار سے بیانیے کی سیڑھیاں اترتا چلا جائے گا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو داغ دہلوی اردو غزل کے کلاسیکل اسلوب کا آخری بڑا شاعر ہے جس نے اپنے پر آشوب معاصر عہد کی بھرپور تصویر کشی کی مگر کہیں بھی ادبیت کا سنجابی دامن مسکنے نہیں دیا۔ ان کا کلام سہل ممتنع کی ایک خاص ادا لیے بہت سادہ بھی ہے اور نہایت تہہ دار یا پیچیدہ بھی۔ آج تک ہم بالعموم اس کی جو قرآت کرتے آئے ہیں اس سے مذکورہ کلام کی محض سطحی معنویت ہی ہاتھ لگ پائی ہے جس کی حیثیت ایک خوش ذائقہ پھل کے چھلکے سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اس کے روح افزا معنویت سے شادمان ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں کلام کی بیرونی سطح سے گزر کر اندرونے کی دانش افروز تہوں میں اترنا ہو گا اور وہ معنیاتی کوڈز تلاش کرنا ہوں گے جن کے ملتے ہی اس پر مغز کلام کی نوع بہ نوع معنویتیں قفل ابجد کی طرح کھل کر ہمارے سامنے آموجود ہوتی ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

1. نیاز احمد صابری(مرتب): کلیات شاہ نیاز، لاہور: سیرت فاؤنڈیشن، ۲۰۰۶ء، ص ۲۴۲
2. علامہ اقبال نے اپنے یورپ کے زمانہ طالب علمی میں ایک غزل کہی تھی جس کے ذیلی شعر سے ایسی بصیرت آشکار ہوتی ہے:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا

(علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، لاہور: شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، س ن، ص ۱۵۰)

3. صائب: دیوان صائب، کراچی: نیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۱ء، ص ۱۱۵
4. پیٹر بیری: Beginning Theroy, An Introduction to Literary and Cultural Theory، نیویارک: مانچسٹر یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷
5. طارق ہاشمی، ڈاکٹر: اردو غزل۔۔۔ نئی تشکیل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء، ص ۶۱
6. مہر، غلام رسول(مرتب): نامہ غالب، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۵۵۰
7. فتح محمد ملک، پروفیسر: تعصبات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵
8. داغ دہلوی: مہتاب داغ، مرتبہ: سیّد سبط حسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۰
9. داغ دہلوی: یاد گارِ داغ، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۹۸
10. داغ دہلوی: مہتاب داغ، ص ۸۹
11. داغ دہلوی: یاد گارِ داغ، ص ۸۸
12. داغ دہلوی: مہتاب داغ، ص ۲۴۶
13. ایضاً، ص ۱۸۳
14. داغ دہلوی: آفتاب داغ، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۱ء، ص ۲۹۰
15. داغ دہلوی: یاد گارِ داغ، ص ۱۷
16. ایضاً، ص ۴۲
17. ایضاً، ص ۲۹۳
18. ایضاً، ص ۵۱

19. محمود الرحمٰن، ڈاکٹر: جنگ آزادی کے اردو شعرا، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق، تنقید وثقافت، ۱۹۸۶ء، ص ۵۴۳
20. عابد علی عابد: اصولِ انتقاد ادبیات لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۳۳۷
21. طارق ہاشمی، ڈاکٹر: اردو غزل اور نیرنگی سیاست دوراں، مشمولہ: جنرل آف ریسرچ ملتان، زکریا یونی ورسٹی ملتان، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱
22. یہ ترکیب اکبر الہ آبادی نے استعمال کی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اگر اکبر جیسا نکتہ شناس جو خود مقتدر کلامیے کے جبر کی وجہ سے عمر بھر شاہد معنی کو فکاہیہ پیرہن پہناتا رہا، داغ کے تخلیقی قرینے کو سمجھنے میں کیوں کر سہل انگاری کا شکار ہو گیا جب کہ اپنے کلام کی رد تشکیلی ساختوں کے بارے میں انھوں نے جگہ جگہ اشارے کنایے سے اظہار خیال کیا ہے۔(ر۔ک، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا(مرتب): نثر اکبر الہ آبادی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۷۷)
23. سودا، رفیع الدین: کلیات سودا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۱
24. میر، کلیات میر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،،، ۲۰۰۸ ص ۴۷۵
25. اکبر الہ آبای: کلیات اکبر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۲
26. داغ دہلوی: مہتاب داغ، ص ۱۰۴
27. داغ دہلوی: یادگارِ داغ، ص ۲۰۷
28. ایضاً، ص ۱۹۸
29. ایضاً، ص ۲۶۸
30. اس قسم کی ورائے متن تعبیرات کے لیے یہی دو مثالیں دیکھیے کہ وزیر کا ایک شعر ہے:

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

یہاں قحط عشاق پر محبوب کو سرد بازاری کا طعنہ دینے پر ناقد بے چارے کو " بے غیرت شعرا" میں شمار کیا گیا نیز غالب کے شعر:

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

کے ضمن میں محبوب کو کسی اور کے عشق میں گرفتار دیکھ عاشق کا اظہار طمانیت کرنا" دیوثانہ خیال" قرار پاتا ہے۔
(ندوی، عبد السلام: شعر الہند، حصہ دوم، طبع: چہارم، اعظم گڑھ: معارف، ۱۹۵۴ء، ص ۳۲۱)

31. محمد علی صدیقی، دیباچہ، مشمولہ: جدیدیت سے پس جدیدیت تک، از: ناصر عباس نیر، ملتان: کاروان ادب، ۲۰۰۰ء، ص ۲
32. شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر: تعبیر کی شرح، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۶
33. داغ دہلوی: یادگارِ داغ، ص ۵۵
34. ایضاً، ص ۴۷